ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

اکتوبر ۲۰۱۸

www.inzaar.pk

October 2018

خواب دیکھیے۔ خواب دیکھنا زندگی کی علامت ہے

مگر خوابوں ہی میں جیتے رہنا موت کی علامت ہے

ماہنامہ

اِنذار

اکتوبر 2018ء محرم/صفر 1440ھ

جلد 6 شمارہ 10

فی شمارہ ـــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

ابویحییٰ کے قلم سے

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ابو یحییٰ کا نیا ناول شائع ہو گیا ہے

”خدا بول رہا ہے“

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

”جس طرح کسی انسان کو اپنی کوئی اولاد بری نہیں لگتی البتہ بعض بچے دوسروں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مصنف کو اپنی بعض تصنیفات زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ یہ قاعدہ اگر ٹھیک ہے تو ”خدا بول رہا ہے“ کی صورت میں اس دفعہ قارئین کی خدمت میں ایک ایسا ناول پیش ہے جس کے متعلق اس خاکسار کا خیال ہے کہ یہ اپنے پیغام کے لحاظ سے بہت موثر اور کہانی کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ یہ اس مصنف ہی کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا بھی خیال ہے جن کی خدمت میں اسے ابتدائی فیڈ بیک یا اسکریننگ کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس لیے امید ہے کہ قارئین اس ناول کو پچھلے ناولوں سے زیادہ مفید اور دلچسپ پائیں گے۔“

ابو یحییٰ

خدا کو آزمانا

پروردگار عالم کے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا: ''خدا نے یہ دنیا ہمیں آزمانے کے لیے بنائی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم اسے آزمانا شروع کردیں۔'' ان عارفانہ الفاظ کو کہے ہوئے دو ہزار برس ہو چکے ہیں، مگر ہم انسان آج بھی خدا کو آزمانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

خدا کو آزمانا کیا ہے؟ یہی کہ ہماری دنیا ہماری مرضی کے مطابق کردی جائے۔ جو ہم مانگیں ہمیں دے دیا جائے۔ جو چاہیں وہ مل جائے۔ ہم جیسا چاہیں حالات ویسے ہی ہو جائیں۔ خدا یہ کرنے کی پوری پوری طاقت رکھتا ہے۔ مگر ایسا کرنے کے بعد ہمارا امتحان ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا امتحان یہی ہے کہ غیب میں رہ کر خدا کو مانیں۔ اپنی پسند کے حالات ہی میں نہیں بلکہ ناگوار حالات میں بھی اس کی بندگی کریں۔ مشکلات کے ہر اندھیرے میں ایمان، توکل اور محبت کی شمع کو روشن رکھیں۔

ہاں اگر خدا کو آزمانے کا شوق ہے، اس سے بات منوانے کی خواہش ہے تو یہ خواہش پوری کی جاسکتی ہے۔ مگر اس کا میدان یہ نہیں کہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بدلا جائے۔ اس کا درست میدان یہ ہے کہ خود کو خدا کی مرضی کے مطابق بدلا جائے۔ خود کو خدا کی مرضی کے مطابق بدلنا بھی اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا دنیا کا ہماری مرضی کے مطابق بدلنا۔ اس راہ میں ساری دنیا ہمارے خلاف کھڑی ہو جاتی ہے۔ قدم قدم پر رکاوٹ آتی ہے۔ اندر باہر ہر جگہ مخالفت کا طوفان اٹھ جاتا ہے۔

مگر ایسے میں جو بندہ خدا کی مدد مانگ لے۔ اللہ تعالیٰ ہر حال میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ مانگنے والا مخلص ہو اور تعصب سے بلند ہو جائے تو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کردی جاتی ہے۔ اس راہ کی سختیاں اس پر آسان کردی جاتی ہیں۔ شیطان کے حملوں سے اسے بچالیا جاتا ہے۔ نفس کی شرارتوں سے اسے پناہ دے دی جاتی ہے۔ خطاؤں کو معاف کردیا جاتا ہے۔ نیکی کی توفیق دے دی جاتی ہے۔ سو جسے خدا کو آزمانا ہو، یہاں آزمائے۔ خدا کو وہ ہر حال میں اپنے ساتھ پائے گا۔

اہل علم ودانش کی سرپرستی

افراد جس طرح دماغ سے سوچتے ہیں،قوموں کے لیےسوچنے کا ذریعہ ان کے اہل علم ودانش ہوتے ہیں۔ یہ اہل علم ودانش غوروفکر کرتے ہیں اوراپنے نتائج فکر کو کتابوں کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔ پاکستان میں بدقسمتی سے کتابوں کے پڑھنے کا رواج ہے اور نہ تحقیقی اداروں کا کوئی چلن عام ہے کہ کوئی ذہین شخص معاشی ضروریات سے بے نیاز ہوکر اپنی زندگی علم وتحقیق میں لگائے اورقوم کی آ گہی میں اضافہ کرے۔ چنانچہ پاکستان میں علم ودانش کی روایت جڑ نہیں پکڑسکی۔

اس کی جگہ یہ سانحہ ہوا ہے کہ اہل صحافت قوم کی فکری قیادت سنبھال چکے ہیں۔ وہ خبریں لکھتے لکھتے پہلے کالم نگار اوراب ٹی وی کے مبصر بھی بن گئے۔قوم اپنی صبح کا آغاز ان کے کالم سے کرتی اور رات کوان کے تجزیے سنتے سنتے نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ چنانچہ اب جو وہ سوچتے ہیں قوم وہی سوچتی ہے اور جو وہ دکھاتے ہیں قوم وہی دیکھتی ہے۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ کرنٹ افیئر ز اور سیاست میں جینا اہل صحافت کی پیشہ ورانہ مجبوری ہے۔ چنانچہ اپنی طرح انھوں نے پوری قوم کو بھی کرنٹ افیئر ز کا دلدادہ اور سیاست زدہ بنا دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کرنٹ افیئر ز اور سیاست ہمیشہ تاریخی اور سماجی عوامل کے تابع ہوتی ہے۔ان چیزوں کا ادراک صرف اہل دانش کو ہوتا ہے نہ کہ اہل صحافت کو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم کو اکثر مسائل کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کرنٹ افیئر ز بن کر سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر لوڈ شیڈنگ کے مسئلے کا علم قوم کو اس وقت ہوا جب عملاً ملک میں بجلی ناپید ہوگئی۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ ہمارے ملک میں ہر مسئلے کا علم ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب وہ سر پر آجاتا ہے۔

اس صورتحال سے اگر نکلنا ہے تو ہمیں اہل علم ودانش کی قدر افزائی کرنی ہوگی ورنہ ایک روز مشرقی پاکستان جیسے کسی سانحے کی اطلاع ہمیں اس وقت ملے گی جب وہ سر پر آ کھڑا ہوگا۔

تاریخ کا سبق

اردو زبان کو وجود میں آئے چند صدیاں ہی گزری ہیں، مگر شعر و ادب کے لحاظ سے دنیا کی کم ہی زبانیں اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اتنے مختصر عرصے میں اتنی اعلیٰ شعری روایت کی ایک بڑی وجہ برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے دورزوال کا وہ ماحول تھا جس میں اعلیٰ ترین ذہانتوں کے لیے مشغولیت کا سب سے بڑا میدان شعروشاعری ہی کا تھا۔

اٹھارہویں صدی کا یہ زمانہ وہ تھا جب دنیا میں انسانی تاریخ کی سب سے بڑی تبدیلی آرہی تھی۔ یعنی یورپ میں 1760 میں صنعتی انقلاب شروع ہو چکا تھا۔ یہ صنعتی انقلاب ایک دم سے نہیں آیا تھا۔ صنعتی انقلاب سے قبل اہل علم و دانش کی زبردست سماجی جدوجہد کے نتیجے میں یورپ میں ایک زبردست فکری انقلاب آچکا تھا۔ اس انقلاب کی بنا پر اعلیٰ ترین ذہانتوں کی دلچسپی کا مرکز سائنسی علوم بن چکے تھے۔ ان سائنسی علوم کی مدد سے اہل مغرب نے مادے کو مشین میں بدل کر طاقت کا توازن اس طرح اپنے حق میں کرلیا کہ دنیا میں کوئی ان کے مقابلے کا نہ رہا۔ اس کی ایک مثال برطانیہ کی عظیم سلطنت تھی۔ سائنس کی اس ترقی کے نتیجے میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہنے والی یہ قوم نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا کے کم و بیش ہر براعظم میں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

علم کی یہی وہ طاقت تھی جس نے برطانیہ کے دورزوال میں اس کو مکمل تباہی سے بچالیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں گرچہ برطانیہ فتح یاب رہا تھا، مگر اس کی طاقت بڑی حد تک ختم ہوچکی تھی۔ برطانیہ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ہٹلر نے دو دہائیوں کی مختصر مدت کے اندر ہی جرمنی کو ایک نئی طاقت بنانے کے بعد 1939 میں دوسری جنگ عظیم شروع کردی۔ ہٹلر کی فوجوں نے انتہائی برق رفتاری کے ساتھ پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، ہنگری، فن لینڈ، آسٹریا، بلجیم،

ناروے، سویڈن، ہالینڈ اور فرانس پر قبضہ کرلیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ برطانیہ پر جرمنی کا قبضہ چند دنوں کی بات لگ رہی تھی۔ برطانیہ اور فرانس کے درمیان سمندر حائل ہونے کی بنا پر ہٹلر نے یہ فیصلہ کیا کہ فوجیں بھیجنے سے قبل اپنی فضائیہ یعنی لفٹ وافے (Luftwaffe) کے ذریعے سے برطانیہ کی کمر توڑ دے۔ یہ کم و بیش وہی طریقہ ہے جسے موجودہ دور میں امریکہ نے عراق اور افغانستان میں استعمال کیا تھا۔ ستمبر 1940 میں فضائی حملہ شروع ہوا۔ اس زمانے میں لفٹ وافے کی فضائی طاقت برطانوی فضائیہ سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ بات کم و بیش یقینی تھی کہ انسانی تاریخ کی اس سب سے بڑی فضائی جنگ میں برطانیہ کو شکست ہو جائے گی۔

مگر عین وقت پر جدید ترین ریڈار کی طاقت برطانیہ کے کام آئی۔ برطانیہ اس وقت ریڈار ٹیکنالوجی میں دنیا میں سب سے آگے تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی پوری سرحد پر ریڈار ٹاور لگا دیے جنھیں چین ہوم کا نام دیا گیا۔ جرمنی کو ان ریڈاروں کی طاقت کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ یہ ریڈار جرمنی کی طاقت ور فضائیہ کے ہر حملے کی اطلاع بروقت برطانوی فضائیہ کو دیدیتے۔ جس کے نتیجے میں ہر بڑے حملے سے پہلے ٹھیک اسی جگہ برطانوی فضائیہ جرمنی کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ہوتی۔ یہ ریڈار سسٹم نہ ہوتا تو جرمنی کی طاقتور فضائیہ برطانوی سرزمین کو تہس نہس کر دیتی۔

گو اس جنگ میں برطانیہ کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ لندن جیسا عظیم شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ فوجی اور سویلین نقصان بھی بہت ہوا۔ مگر زیادہ نقصان جرمنی کا ہوا جس کے 2550 طیاروں میں سے 1977 تباہ ہو گئے جبکہ برطانیہ کے 1963 طیاروں میں سے 1744 تباہ ہوئے۔ ریڈار سسٹم کی بنا پر آخر کار جرمنی کا اپنا نقصان اتنا بڑھا کہ آٹھ ماہ بعد مئی 1941 میں جرمنی کو پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد ہٹلر دوبارہ برطانیہ پر حملہ نہیں کر سکا۔ لیکن اگر ریڈار سسٹم نہ ہوتے تو

عددی اور معیاری طور پر بہتر جرمنی فضائیہ برطانوی فضائیہ کو شکست دے کر تاریخ کا رخ موڑ چکی ہوتی۔

مغربی مما لک میں آج کے دن تک علم وٹیکنالوجی میں ترقی کا یہ سفر جاری ہے۔انھوں نے اس عظیم جنگ سے مزید یہ سبق سیکھا کہ جنگ اچھی چیز نہیں۔کم از کم اپنی زمین پر جنگ لڑنا بہت بڑی حماقت ہے۔مگر بدقسمتی سے ہم ابھی بھی وہیں کھڑے ہوئے ہیں جہاں اٹھارہویں صدی میں کھڑے تھے۔فرق صرف یہ ہوا ہے کہ شعروشاعری کے بجائے ہماری بیشتر ذہانتیں سیاسی اور مذہبی انتہا پسندی کی نذر ہورہی ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ سماجی اور معاشی طور پر ہمارا معاشرہ بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔ ہماری اقدار تباہ ہورہی ہیں۔ ہمارے ادارے برباد ہورہے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے بنیادی انسانی ضروریات پوری کرنا مشکل ہو چکا ہے۔نوجوانوں کے لیے تعلیم، روزگار اور اس کے نتیجے میں شادی جیسی لازمی ضروریات کا حصول بہت مشکل ہو چکا ہے۔عام آدمی کے لیے صحت سے لے کر تفریح تک کسی چیز میں معیاری خدمات کا حصول ایک خواب بن چکا ہے۔

اس صورتحال کو بدلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔وہ یہ کہ ہم اپنی ذہانتوں کا رخ انتہا پسندانہ مذہبی اور سیاسی افکار سے موڑ کر سماجی اور سائنسی علوم کی طرف موڑیں۔ یہ ایک مشکل جدوجہد ہے۔مگر یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہمارا سماج ایک بہتر جگہ پر آ سکتا ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ بڑے اہل علم کی طرف سے انتہا پسندانہ افکار پر علمی تنقید کر کے ان کی بے وقعتی کو واضح کر دیا گیا ہے بلکہ عملی طور پر بھی لوگوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ انتہا پسندانہ خیالات آخر کار کس طرح ملک کو دہشت گردی اور خونریزی کا شکار کر دیتے ہیں۔اسی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے برسوں میں ہماری ذہانتوں کا رخ انتہا پسندی کے بجائے سماجی اور سائنسی ترقی کی سمت ہوگا۔

متشابہات اور فتنہ

سورہ آل عمران آیت 7 میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں کچھ آیات متشابہ ہیں۔ فتنہ پرور لوگ فتنہ کی تلاش میں ان متشابہ آیات کے درپے ہو کر ان کی حقیقت اور ماہیت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

قرآن مجید کے سنجیدہ طالب علموں کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا ہے کہ یہ متشابہ آیات کون سی ہیں؟ اور یہ کہ کیا ان کے متعلق کوئی سوال کرنا اور ان کی شرح و وضاحت چاہنا یا کرنا کیا بالکل غلط ہے؟ اس بات کا جواب قرآن مجید نے اس آیت میں خود ہی دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ جس قسم کے لوگوں کی یہاں مذمت ہو رہی ہے وہ ہدایت کے متلاشی نہیں بلکہ ''زیغ قلب'' یعنی دلوں کی کجی اور ٹیڑھ پن کا شکار وہ لوگ ہیں جو اپنے تعصّبات کے تحت پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں کہ انھیں قرآن کی دعوت کو اس کی محکم آیات سے نہیں سمجھنا بلکہ فتنہ کی تلاش میں کوئی ایسی بات بیان کرنا ہے جس سے ان کے کفر و انکار کو کوئی عقلی اور علمی جواز مل سکے۔

قرآن مجید کی محکم آیات تو عقل و فطرت اور مسلمہ علم کی ایسی محکم اساسات پر کھڑی ہیں کہ ان میں کوئی خرابی نکالی نہیں جا سکتی۔ مثلاً ایک اللہ کی توحید، اس کی عبادت، مخلوق کے ساتھ عدل و احسان، انبیا کی تاریخ اور انفس و آفاق کے دلائل کو بیان کرتی ہوئی آیات میں خرابی نکالنا ممکن نہیں۔ اب لے دے کے جو چیزیں بچتی ہیں وہ ایسے حقائق کا بیان ہیں جنھیں انسان اپنے حواس اور معلوم علم کی بنیاد پر نہیں سمجھ سکتا۔ ان حقائق کو بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو استعمال کیا ہے جو انسان کے لیے معلوم ہیں۔

مثلاً روح کے پھونکے جانے کا عمل، وحی، خدا کی صفات کے بعض پہلو اور آخرت کی دنیا کے حقائق انسان اپنے موجودہ علم کے ساتھ پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ ان کو دنیا میں پائی جانے

والی متشابہ یا ملتی جلتی چیزوں سے سمجھایا ہے۔اس کی سادہ ترین مثال خود جنت ہے۔ جنت دنیا کے امتحان میں فلاح پانے والوں کا ابدی ٹھکانہ ہے۔ یہ کائنات کے قادر مطلق بادشاہ کا بنایا ہوا مقام انعام ہے۔اس لیےاس میں موجود انعامات کا تصور بھی احاطہ ادراک سے باہر ہے۔اسے قرآن نے جنت کا نام دیا ہے۔ جنت عربی میں باغ کو کہتے ہیں۔مگراس سے مراد یہ نہیں ہے کہ جنت بس دنیا کے باغوں جیسا ایک باغ ہے۔

جنت کا نام اختیار کرنے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ عربوں کے لیے بے آب و گیاہ صحرا میں سب سے بڑے مقام عیش کا تصور ایک باغ کا تھا۔ویسے بھی ساری دنیا اور ہر دور کے انسان باغوں کو ایک اچھی جگہ سمجھتے آئے ہیں۔ چنانچہ اسی مشابہت کی بنا پر اس لفظ کو اٹھالیا گیا۔مگر کوئی شخص کہے کہ جنت یعنی باغ تو میرے گھر میں بھی ہے تو ظاہر ہے ایسا شخص فتنہ پیدا کرنے کے لیے یہ باتیں کرے گا۔

قرآن کے نزول کے زمانے ہی میں ایسی کئی باتیں سامنے آ گئی تھیں۔مثلاً یہ کہ قرآن نے سورہ مدثر میں بیان کیا کہ جہنم پر انیس نگران مقرر ہیں تو کفار نے شور مچا دیا کہ صرف انیس نگران کیسے اتنے سارے اہل جہنم کو قابو کر سکتے ہیں۔ یا یہ کہ ایک طرف قرآن نے جہنم کی آگ سے ڈرایا ہے اور دوسری طرف اسی میں زقوم کے درخت کو اہل جہنم کا کھانا قرار دیا ہے۔آگ میں درخت کیسے رہ سکتا ہے؟ یا قرآن میں مچھر اور مکھی کی مثالیں کیوں ہیں؟

ایسی ہی فتنہ انگیزیاں تھیں جن کی طرف قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیات میں توجہ دلائی ہے۔ اس کا کوئی تعلق فہم قرآن کے اس عمل سے نہیں ہے جس میں دین کا ایک محقق عالم یا طالب قرآن مجید میں بیان کردہ آیات بشمول متشابہات کی شرح وضاحت کرتا ہے۔ چنانچہ اوپر جنت والی مثال کو بطور نمونہ لے لیا جائے تو مفسرین،قرآن مجید کے الفاظ کی روشنی میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے

بیان کیا ہے، اس کا مفہوم سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔صحابہ کرام کے ذہن میں جب جنت کے حوالے سے سوالات پیدا ہوئے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوالات کیے۔آپ نے ان سوالات کے جواب دیے۔مفسرین نے جنت کی نعمتوں کی تفصیل میں قرآن مجید کے بیانات کی تفسیر میں بہت کچھ کہا ہے۔ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے سورہ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تحت ممنوع قرار دیا جائے۔

بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ جس چیز سے یہاں روکا گیا ہے وہ ان آیات متشابہات کی تاویل یعنی حقیقت متعین کرنے کی کوشش کرنا ہے۔مثلاً روح کیا ہے، اس کی حقیقت کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔لیکن جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان کی نوعیت تو بہر حال قرآن کے اپنے الفاظ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔مثلاً زقوم ایک درخت ہے۔اس کی یہ نوعیت تو خود قرآن نے بیان کر دی ہے۔اسی طرح حوروں کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ ہم اہل جنت کو ان سے بیاہ دیں گے۔زوجیت کا یہ تعلق واضح کر دیتا ہے کہ وہ خواتین ہیں۔قرآن کے الفاظ کی روشنی میں اس طرح کی چیزوں کی نوعیت کو بیان کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ۔یہ نوعیت قرآن مجید کے الفاظ سے، ان کے معنی سے، اسلوب بیان سے اور سیاق کلام سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

جو چیز ممنوع ہے وہ قرآن مجید کے بیانات کو اپنی فتنہ انگیزی کا نشانہ بنانا ہے۔اپنے ناقص علم اور محدود عقل کی روشنی میں کلام الٰہی پر اعتراض کرنا ہے۔قرآن کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ اس کی محکم آیات کے بجائے اس کی متشابہ آیات پر کرنا ہے۔قرآن مجید کے اپنے الفاظ کو معیار بنانے کے بجائے اپنی نکتہ آفرینی کو آخری حقیقت قرار دینا ہے۔ یہ ساری چیزیں ممنوع ہیں۔ ایک بندہ مومن سے ان چیزوں کا صدور کبھی نہیں ہوسکتا۔

شریعت، ہدایت اور خدا کی عدالت

قرآن مجید صحیفہ رسالت ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی پر نازل ہوا جسے دیگر انبیا علیہم السلام کی طرح دنیا تک ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری ہی نہیں دی گئی بلکہ جسے بھیجے جانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب وہ اپنی دعوت کو اتمام حجت تک پہنچا دے گا تو اس کے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت لگا دی جائے، منکرین پر عذاب آئے اور ماننے والوں کو بچا کر زمین کا وارث بنا دیا جائے۔ اس طرح اس کے بارے میں یہ ایک مسلمہ بن جائے کہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا یعنی اس کا رسول ہے۔

اس پس منظر میں قرآن مجید خدا کی ہدایت کے پہلو سے ایمان، اخلاق اور شریعت کے مباحث ہی کو بیان نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے پہلو سے منکرین پر اتمام حجت کی وہ پوری روداد بھی بیان کرتا ہے جو سابقہ رسولوں کے معاملے میں پیش آئی اور آخری دفعہ آخری نبی اور رسول کے مخاطبین کے معاملے میں برپا کی گئی۔

ہدایت اور اس کے ذیل میں بیان کردہ ایمان، اخلاق اور شریعت کے مباحث اور احکام ابدی نوعیت کے ہیں۔ ان کی پاسداری ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں سے مطلوب ہے۔ اس کے برعکس خدا کی عدالت کے ضمن میں جو سزا و جزا اس دنیا میں برپا کی گئی، وہ کار رسالت کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اس کا کوئی تعلق عام لوگوں سے نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن اس تفصیل سے بھرا ہوا ہے کہ رسول کی دعوت دنیا کے عذاب کی وعید سے شروع ہوتی ہے اور اس واقعہ کے عملاً ظہور پر ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز کسی اور شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس پہلو سے دیکھیے تو باقی انسانیت کے لیے خدا کی عدالت کا یہ تصور اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک حجت کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اس سے یہ حقیقت آخری درجہ میں ثابت ہوتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول تھے۔ تاہم خدا کی عدالت کے اس تصور میں باقی انسانیت

کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کہ وہ اس خاص پہلو سے رسول کا اتباع کریں یا اس کے مشن کو اپنی زندگی بنا کر دنیا پر رسول کی طرح اتمام حجت کریں جس کے بعد لازماً منکرین پر عذاب آ جائے۔

فراہی مکتب فکر کے اہل علم نے اس تصور کو نہ صرف پوری طرح واضح کیا ہے بلکہ اس کے اطلاقی پہلو کو نمایاں کر کے ان چند امور کی طرف اہل علم کو متوجہ کیا ہے جن میں رسالت کے ساتھ مخصوص احکام کی تعمیم کر کے اس شریعت کا موضوع بنا دیا گیا ہے جس کا مطالبہ تمام زمان و مکان کے لوگوں سے ہے۔ ان احکام میں دو چیزیں نمایاں ہیں۔ ایک رسول کی اپنی دعوت جس کو اس کی نوعیت (یعنی اس کا تعلق خدا کی عدالت سے ہے اور جس کا لازمی نتیجہ خدائی سزا جزا کی شکل میں نکلے گا) کو نہ سمجھنے کی بنا پر اسے امت کا نصب العین بنا دیا گیا۔ دوسرے صحابہ کرام کا وہ قتال جس کا مقصد قرآن مجید کے مطابق صحابہ کے ہاتھوں منکرین کو عذاب دینا ہے، (التوبہ 14:9)۔

چنانچہ اس پس منظر میں یہ توجہ دلائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اظہار دین کی جس نسبت کے ساتھ مبعوث کیے گئے وہ آپ کے ساتھ خاص تھا اور مکمل طور پر آپ کی حیات مبارکہ میں ہو چکا ہے۔ اس کا بعد کے مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس سے عام مسلمانوں کی زندگی کا نصب العین اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں دعوت دین کا کام اپنے اپنے پہلوؤں سے فرد، علماء اور ریاست سب کرتے رہیں گے کہ شریعت نے اس پہلو سے ان کے سامنے مطالبات رکھے ہیں۔

اسی طرح منکرین پر اتمام حجت کے بعد انھیں سزا دینے کے لیے جو جہاد صحابہ کرام نے کیا، وہ بھی آج کے لوگوں سے متعلق نہیں ہے۔ بلاشبہ انھیں جہاد کا حکم شریعت کے ایک حکم کے طور پر دیا گیا اور اس حیثیت میں جہاد شریعت کا ایک ابدی حکم ہے، لیکن صحابہ کرام کے سامنے اس کا ایک دوسرا مقصد بھی رکھا گیا تھا یعنی سرزمین عرب میں غلبہ دین۔ اس مقصد سے جہاد کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کرے گا تو وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا اور جو صحابہ کے معاملے میں

حاصل ہو بھی گیا تھا۔

انھی دو دائروں کے ذیل میں کچھ فروعی چیزیں بھی ہیں جن کے بارے میں یہ توجہ دلائی جاتی ہے کہ یہ عمومی شریعت کا حصہ نہیں ہیں بلکہ اسی اتمام حجت کے ذیل میں آتی ہیں۔ تاہم ان سے ہٹ کر ایمان و اخلاق کی پوری دعوت اور مطالبات اور شریعت کے تمام احکام ابدی نوعیت کے ہیں۔ ان کا کوئی تعلق اس دنیا میں لگنے والی خدائی عدالت سے نہیں ہے۔ ان کی پابندی ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں سے مطلوب ہے۔

شریعت کے ان احکام میں سے کسی چیز کی تخصیص کسی اور وجہ سے تو کی جا سکتی ہے، مگر قانون اتمام حجت کی وجہ سے نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اتمام حجت کا قانون عذاب کے چیلنج سے شروع ہوتا ہے اور عذاب آنے پر ختم ہوتا ہے۔ یہ چیز صرف رسول کے ساتھ خاص ہے۔

اسی طرح خدا کی اس عدالت نے آخری دفعہ سزا کا جو فیصلہ سنایا اس میں صحابہ کو مخاطب کر کے بتا دیا گیا تھا کہ آلہ عذاب تمھاری تلواریں ہوں گی۔ انھیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ خدا کے فرشتے اس عمل میں تمھارے ساتھ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کا پیشگی نتیجہ قرآن مجید نے ان واقعات کے ظہور سے پہلے بتا دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ چیزیں کسی اور انسان یا گروہ کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اس ضمن میں ایک آخری قابل وضاحت بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعے میں ایک طالب علم یہ کیسے فیصلہ کرے کون سی چیز خاص ہے اور کون سی عام۔ اس بات کو بھی ہدایت اور عدالت کے فرق کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جو چیز ہدایت کے ذیل کی ہے یعنی ایمان، اخلاق اور شریعت تو اس کے تقاضوں کی پابندی ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر جو کچھ ہے اس کا تعلق خدا کی عدالت سے ہے۔ اس میں ہمارے لیے احکام تو نہیں نکلتے، مگر انذار، تبشیر، تذکیر، اسباق اور دلائل ضرور موجود ہیں۔ ان چیزوں کی ہمیں بھی ضرورت ہے اور اسی بنا پر انھیں قرآن مجید کا ایک مستقل حصہ بنا کر قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

ابو یحییٰ

For Whom The Bell Tolls

معروف امریکی سینیٹر جان مکین 25 اگست 2018 کو انتقال کر گئے۔ ایک امریکی سینیٹر کا انتقال کوئی ایسی بات نہیں جس پر ایک مضمون لکھا جائے۔ مضمون کی وجہ تصنیف وہ ڈاکیومنٹری ہے جو جان مکین کے انتقال سے قبل ان کی زندگی پر بنائی گئی۔ پچھلے سال جان مکین کو برین ٹیومر کی تشخیص ہوئی تھی۔ جس کے بعد ان کی زندگی پر ایک ڈاکیومینٹری بنائی گئی تھی جس کا عنوان For whom the bell tolls تھا۔ اس سال مئی میں یہ ڈاکیومنٹری منظر عام پر آئی اور اس پر معروف صحافی رؤف کلاسرا صاحب نے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ یہ مضمون ہماری سیاسی اقدار کا ایک نوعیت سے نوحہ بھی تھا کہ کس طرح دنیا بھر کے سیاستدان اخلاقیات کا پاس کرتے ہیں اور ہمارے سیاستدان کس طرح اس کو پامال کرتے ہیں۔

یہ ڈاکومنٹری اس قابل ہے کہ اسے دیکھا جائے اور سیکھا جائے کہ اصولوں کے مطابق سیاست کرنا کسے کہتے ہیں۔ کس طرح قومی اور عوامی خدمت کا جذبہ ایک سیاستدان کو پارٹی وابستگی سے بلند کر دیتا ہے۔ کس طرح اخلاقی اقدار کا شعور اپنے مخالفین کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کو پھیلانے سے روکتا اور اس کی حمایت پر مجبور کر دیتا ہے۔

ڈاکیومنٹری کے نام کا مفہوم

مزید آگے بڑھنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ For whom the bell tolls کا مفہوم واضح کر دیا جائے۔ یہ جملہ ایک انگریز شاعر جان ڈن کے کلام کا ایک جز ہے۔ اس کی بات کو سمجھانے کے لیے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں کسی

کے انتقال پر اطلاع دینے کے لیے مساجد میں اعلان کیا جاتا ہے، اسی طرح مسیحی حضرات میں علاقے میں کسی کی موت کی اطلاع دینے کے لیے چرچ کی گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ اسے فیونرل ٹال (Funeral Toll) کہتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے اس چیز کو اٹھا کر اس طرح بیان کیا ہے۔

Each man's death diminishes me,

For I am involved in mankind.

Therefore, send not to know

For whom the bell tolls,

It tolls for thee.

مطلب یہ کہ ہر انسان کی موت میرا ہی نقصان ہے کیونکہ میں انسانیت سے متعلق ہوں۔ اس لیے جب گرجا کی گھنٹی بجے تو کسی کو یہ پوچھنے کے لیے نہ بھیجو کہ یہ کس کی موت پر بجائی جارہی ہے۔ یہ تو تمھارے لیے ہی بجائی جارہی ہے۔

یہاں سے اس جملے کو نوبل انعام یافتہ مصنف ارنسٹ ہمنگ وے نے لیا اور دوسری جنگ عظیم سے قبل اسپین میں جاری خانہ جنگی کے موضوع پر لکھے جانے والے اپنے مشہور ناول کا نام بنادیا۔ اسپین کی خانہ جنگی اس اعتبار سے مغرب کی تاریخ میں بڑی اہم ہے کہ یہ فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا اور اٹلی میں مسولینی کا طوطی بول رہا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں اسپین میں جمہوریت پسندوں اور فاشسٹ قوم پرستوں کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی۔ فاشسٹوں کو مسولینی اور ہٹلر کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ ان کے مقابلے کے لیے تمام مغربی دنیا سے رضا کار جمہوریت پسندوں کی طرف سے لڑنے کے لیے اسپین پہنچے۔ ارنسٹ کے ناول کا ہیرو بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو امریکہ سے اسپین یہ جنگ لڑنے گیا اور اپنی جان اور محبت دونوں ایک اعلیٰ مقصد کے لیے

قربان کردی۔

جان مکین اور ناول

ناول کا یہ نام اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے بلند ایک اعلیٰ مقصد کے لیے جینا چاہیے۔ یہ ناول جان مکین نے چھوٹی عمر میں اپنے والد کی لائبریری سے پڑھا اور زندگی بھر وہ اس ناول اور اس کی کہانی کے مرکزی خیال کے اسیر ہو گئے کہ انسان کو اپنی ذات سے بلند ایک اعلیٰ مقصد کے لیے جینا چاہیے۔ جان مکین بڑے ہوئے تو اپنے باپ اور دادا کی طرح جو نیوی کے فور اسٹار جنرل تھے، نیوی میں شامل ہوئے۔ اسے اپنے ذوق کے مطابق نہ پا کر بعد میں فضائیہ میں شامل ہو گئے۔ ویتنام کی جنگ میں امریکہ کی طرف سے حصہ لیا۔ ایک ہوائی مشن میں ان کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ قیدی بنا لیے گئے اور پانچ برس تک انتہائی تکلیف دہ قید جھیلی۔

وطن لوٹنے کے کچھ عرصے بعد سیاست میں حصہ لیا۔ 1983 میں وہ امریکی ایوان نمائندگان کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کے بعد 1987 میں سینیٹر منتخب ہوئے اور اپنی وفات تک مسلسل چھ دفعہ اس منصب کے لیے چنے گئے۔ اس کے علاوہ سن 2000 میں وہ ریپبلکن صدارتی امیدواروں کی دوڑ میں شامل ہوئے، مگر ابتدائی مرحلے میں جارج بش ان سے آگے نکل گئے۔ تاہم 2008 میں وہ ایک دفعہ پھر اس دوڑ میں شامل ہوئے اس دفعہ وہ باراک اوباما کے مقابلے میں ریپبلکن پارٹی کے صدارتی امیدوار منتخب ہوئے۔ مگر ان کی بدقسمتی کہ صدر بش اپنے آٹھ برسوں میں امریکہ کو اتنا بدحال چھوڑ کر گئے تھے کہ لوگ مزید کسی ریپبلکن امیدوار کو موقع دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ صدر نہ بن سکے۔

تاہم سن 83 سے اپنی وفات تک 35 برسوں میں انھوں نے انتہائی فعال سیاسی زندگی گزاری۔ انھوں نے ان گنت اہم قوانین کی منظوری میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے

انھوں نے اپنی پارٹی ریپبلکن کے علاوہ مخالف ڈیموکریٹک پارٹی کے اراکین کے ساتھ مل کر اور پارٹی پالیٹکس سے بالاتر ہو کر اپنی قوم کے مفاد میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔

قانون سازی کی اہمیت

اہل پاکستان کو یہ بات بڑی عجیب لگے گی کہ اسمبلی کا ایک ممبر عام آدمی کے مفاد کے لیے کوئی قانون بنانے کی جدوجہد کرے اور اس مقصد کے لیے مخالف پارٹی کے حق میں اور اس کے اراکین کے ساتھ مل کر بھی قانون سازی میں حصہ لے۔

دراصل یہ پاکستانی سیاست کا بڑا المیہ ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں امریکہ کے برعکس اصلاً پارلیمانی نظام نافذ ہے، پارلیمان کی کوئی حیثیت نہیں۔ بظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ وزیراعظم کا انتخاب پارلیمنٹ کرتی ہے اور وہ اسی پارلیمنٹ کو جواب دہ ہے۔ ہر قانون پارلیمنٹ میں بنتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں پارٹی کا سربراہ اور وزیراعظم سب کچھ ہوتا ہے۔ ہر قانون اسی کی مرضی اور ایما پر بنتا ہے۔ ارکان اسمبلی کی حیثیت ربر اسٹیمپ کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر لوگ کیوں ممبر بنتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک کاروبار ہے۔ کروڑوں خرچ کر کے لوگ اس لیے اسمبلی میں آتے ہیں کہ اسے اربوں میں تبدیل کریں۔ اس معاملے میں وہ اس حد تک جاتے ہیں جس کا ذکر رؤف کلاسرا صاحب نے اپنے مذکورہ بالا کالم میں کیا تھا کہ صرف پانچ ہزار روپے کے الاؤنس کے لیے ارکان اسمبلی اپنی جعلی حاضریاں لگواتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کسی کردار، امانت اور دیانت کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

خرابی کا علاج

اس تحریر کا مقصد مایوسی پھیلانا یا جمہوریت کے بجائے آمریت کی کسی قسم کی تائید کرنا ہرگز نہیں۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جمہوریت اس عمل کا نام ہے جس میں جان مکین جیسے لوگ ملک

وقوم کی خدمت کے جذبے سے اسمبلی کے ممبر بنتے ہیں۔ یہ کیسے ہوگا اس پر ہم آگے بات کریں گے، مگر سردست یہ گزارش پیش کرنا ہے کہ اس طرح کی تمام بدعنوانیوں کا جو علاج خود جمہوری ممالک نے نکالا ہے وہ شفافیت اور معلومات تک رسائی کا قانون ہے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ سیاستدانوں کو کنٹرول کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی ذاتی زندگی، مالی معاملات، حکومتی سطح پر کیے گئے تمام سودے اور اس طرح کی تمام چیزوں کی مکمل معلومات عوام کی رسائی میں ہوں۔ اس کے بعد صحافی حضرات ان تمام خرابیوں اور بدعنوانیوں کو عوام کے سامنے لے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے جمہوریت میں صحافت کو مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے بعد ریاست کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ شفافیت اور معلومات تک عوام کی رسائی سیاستدانوں کو کنڑول کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ حکومتی سطح پر جو چیز چھپائی جاتی ہے اس میں بدعنوانی خود بخود ہو جاتی ہے۔

باقی اس مسئلے کا اصل حل یعنی کرپٹ اور نااہل لوگوں کے بجائے باکردار اور خدمت کے جذبے سے سرشار لوگ سیاست میں آئیں، وقت طلب ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاست میں رہ کر سیاست کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ یہ سیاست سے باہر رہنے والے دانشوروں اور مفکرین کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کی تربیت کریں۔ ان میں اخلاقی شعور کو پیدا کریں۔ جان مکین کی زندگی میں ایک کتاب نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس کتاب نے ان کو یہ اصول دیا کہ اپنی ذات سے بلند ہوکر کوئی مقصد بنانا چاہیے اور اس کے لیے زندگی لگا دینی چاہیے۔

یہی وہ شعور ہے جو آج ہمیں لوگوں میں پھیلانا ہے۔ آج کے لوگ چاہے اس پکار کو نہ سنیں، اگلی نسل ضرور سنے گی۔ مستقبل میں ایسے لوگ سیاست میں آئیں گے جو ذاتی مفاد کے بجائے اجتماعی مفاد اور اصولوں کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔

دوسروں کی موت میں اپنی خبر

مضمون کے آخر میں For whom the bell tolls کے ایک دوسرے مفہوم کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے۔ انگریز شاعر نے جو بات کہی تھی اس کا ایک مفہوم یہ بھی تھا کہ موت کی اطلاع دینے والی گھنٹی کے بعد یہ جاننے کے لیے کسی کو نہ بھیجو کہ یہ کس کے لیے بجائی گئی ہے۔ یہ دراصل تمھارے لیے بجائی گئی ہے۔ یہ اس بات کا وہ دوسرا مفہوم ہے جسے سیاستدانوں کو ہی نہیں بلکہ ہر شخص کو سمجھنا چاہیے۔ اس دنیا میں بادشاہ بھی موت سے نہیں بھاگ سکتے۔ ہر شخص یہاں مرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں دوسروں کی موت کی اطلاع پر انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس کے لیے ایک وارننگ ہے۔ جو حادثہ دوسروں کے ساتھ پیش آیا ہے وہ تمھارے ساتھ بھی پیش آئے گا۔ چاہے کوئی شخص جائز ناجائز طریقے سے اربوں بنالے، اسے ایک روز سب کچھ چھوڑ کر اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہاں انسان سے زندگی کے ہر ہر لمحے کا حساب ہوگا۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جو آج زندگی کی مہلت عمل سے فائدہ اٹھا کر آخرت کی تیاری کرے۔ جس نے نافرمانی اور غفلت کا راستہ اختیار کیا، جلد وہ جہنم کو اپنا ٹھکانہ پائے گا۔ اس لیے کسی کی موت کی اطلاع پر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دراصل ہماری موت کی اطلاع ہے جو پیشگی طور پر ہمیں دے دی گئی ہے۔

Therefore, send not to know

For whom the bell tolls,

It tolls for thee.

جہاں رہیے اللہ کے بندوں کے لیے باعثِ زحمت نہیں، باعثِ رحمت بن کر رہیے۔

یاسر پیرزادہ

ہم خود کو بہت سیانا سمجھتے ہیں

ہم سب لوگ خود کو بہت سیانا سمجھتے ہیں، ہمیں یہ زعم ہے کہ ہم زندگی کے فیصلے بہت سمجھداری سے کرتے ہیں، ہمیں یہ خوش فہمی ہے کہ اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے ہم عقل سے کام لیتے ہیں، ہمیں یہ مغالطہ ہے کہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں ہم دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہمیں یہ گمان ہے کہ ہمارے ہر فیصلے کی بنیاد مفروضوں کی بجائے ٹھوس حقائق پر ہوتی ہے۔ چلئے اِن باتوں کو آزما کر دیکھتے ہیں۔

اِس خاتون سے ملیے، عمر 30 برس، تعلیم ایم بی اے، وزن پچاسی کلو، گزشتہ دو سال سے وزن کم کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں مگر کامیاب نہیں ہوئیں، نیک نیت ہیں، پڑھی لکھی ہیں، بسکٹس سے لے کر کیک تک ہر چیز کی غذائیت کے بارے میں انہیں اچھی طرح پتہ ہے، وزن کم کرنے کی تمام تکنیک انہیں زبانی یاد ہیں، انہیں یہ علم ہے کہ بڑھتا ہوا وزن اِن کی صحت اور حسن کے لیے اچھا نہیں مگر اِس کے باوجود وزن کم کرنے میں ناکام ہیں۔

اِن صاحب سے ملیں، اِن کی عمر پچاس برس ہے، یہ بھی پڑھے لکھے ہیں، سگریٹ نوش ہیں بلکہ بلانوش ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عادت کن بیماریوں کا باعث بن سکتی ہے، اِس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں، مگر اب تک نہیں چھڑا پائے۔

اِس بزنس مین سے ملیں، یہ بھی ایک سیانا آدمی ہے، خوش حال ہے، اپنے بزنس کو بڑھاوا دینا چاہتا ہے، اس کے لیے مختلف منصوبے بناتا ہے مگر کسی پر عمل نہیں کر پاتا، گزشتہ پانچ برس میں اِس مردِ عاقل نے نئے سال کے موقع پر پانچ منصوبے بنائے مگر کسی ایک پر بھی عمل نہیں کر پایا حالانکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ اگر وہ اِن میں سے ایک پر بھی عمل کر لیتا تو آج اُس کا کاروبار کئی گنا

بڑھ چکا ہوتا اور اب اِس نوجوان کو دیکھئے، اے لیول میں پڑھتا ہے، مستقبل میں امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلے کا خواہشمند ہے، ذہین ہے مگر موبائل فون کے نشے میں مبتلا ہے، دن کا زیادہ تر وقت موبائل فون میں ضائع کر دیتا ہے، پڑھائی سے توجہ ہٹ چکی ہے، اس صورتحال کا بخوبی ادراک ہے مگر خود کو بے بس محسوس کرتا ہے، ہر ایک منٹ بعد ہاتھ خود بخود موبائل فون کی طرف اٹھ جاتے ہیں اور وقت ضائع ہوتا رہتا ہے۔

اِس قسم کی کروڑوں مثالوں سے دنیا بھری پڑی ہے، لوگ جانتے بوجھتے ہوئے ایسے کام کرتے ہیں، ایسے فیصلے کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں ایسا انتخاب کرتے ہیں جو اکثر اوقات اُن کے مفاد میں نہیں ہوتا۔ ہم سب کو برگر، چپس، سوفٹ ڈرنک، سگریٹ کے نقصانات کا علم ہے مگر اس کے باوجود ہم خود کو اُن سے روک نہیں پاتے۔ ہمیں اچھی طرح پتہ ہے کہ موبائل فون کا زیادہ استعمال سراسر وقت کا ضیاع ہے مگر ہم غیر ارادی طور پر اِس سے چمٹے رہتے ہیں اور ہمیں یہ بھی سکھایا گیا ہے کامیابی کے لئے اچھی منصوبہ بندی پر عمل درآمد ضروری ہے مگر اِس کے باوجود ہم اِس کلیے پر عمل نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ لوگ بنیادی طور پر سہل پسند ہوتے ہیں اور وہ دانش مندانہ فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرتے ہیں جو آسان اور پُر لطف ہو۔ لوگوں کے پاس چونکہ سوچنے کا وقت کم ہوتا ہے، پرانی عادتوں سے جان چھڑانا مشکل ہوتا ہے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی ہے اسی لیے لوگ غیر صحت بخش غذا کھاتے ہیں چاہے اُن کے سامنے جلی حروف میں غذائیت کا چارٹ ہی کیوں نہ لٹکا دیا جائے، وہ وزن کم کرنے کی اچھی نیت رکھنے کے باوجود یہ سوچ کر گلاب جامن منہ میں ڈال لیتے ہیں کہ ایک سے کچھ نہیں ہوتا اور اِس کا مزا بھی خوب ہے۔ اِس انسانی رویے کو امریکی ماہر معاشیات رچرڈ تھیلر نے ایک تھیوری کی شکل میں پیش کیا اور ثابت کیا کہ کیسے انسانوں کے نفسیاتی مفروضے معاشی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے

ہیں، اِس کو سمجھانے کے لیے انہوں نے ایک ترکیب ایجاد کی جسے Nudging کا نام دیا، اِس لفظ کا اردو ترجمہ ٹہوکا لگانا ہوسکتا ہے، سو موصوف کی تھیوری کو ہم نظریہ ٹہوکا کہہ سکتے ہیں، اِس نظریئے کے خالق کے طور پر پروفیسر تھیلر کو 2017 میں نوبل انعام سے نوازا گیا اور بارہ کروڑ روپے کی رقم نذرانے کے طور پر انہیں پیش کی گئی جس کے بارے میں پروفیسر صاحب نے کہا کہ جتنا ممکن ہوا میں اِس پیسے کو غیر دانشمندانہ انداز میں خرچ کروں گا۔

Nudging Theory ہمیں بتاتی ہے کہ فیصلہ سازی کرتے وقت لوگ اپنی عقل کا مکمل استعمال نہیں کرتے بلکہ اُن کی سماجی ترجیحات، آرام پسندی اور خود پر قابو نہ رکھ پانے کی کمزوری فیصلے کے وقت آڑے آ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ طویل المدت دانش مندانہ منصوبہ بندی کے مقابلے میں اکثر شارٹ ٹرم پُر لطف فیصلوں کی جیت ہوتی ہے، یعنی عقل لاکھ کہے کہ ڈبل ڈیکر برگر نہیں کھانا، دل پر قابو نہیں رہتا۔ Nudging Theory نہ صرف روزمرہ فیصلوں میں کام آتی ہے بلکہ اس کا استعمال کاروباری تکنیک اور حکومتی معاملات کو درست کرنے میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بینک اپنے سوکھاتے داروں کو خط لکھتا ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی زندگی کا بیمہ ایک بہترین بین الاقوامی کمپنی سے کروا دیں تو براہ کرم ہمیں اگلے سات دن میں اپنی رضامندی سے مطلع فرمائیں، ہم بیمے کی رقم آپ کے اکاونٹ سے کاٹ کر انشورنس پالیسی گھر بھجوا دیں گے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا بینک اپنے سوکھاتے داروں کو یہی پیشکش کرتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اگر آپ یہ بیمہ نہیں چاہتے تو ہمیں آگاہ کریں بصورت دیگر ہم سمجھیں گے کہ آپ رضامند ہیں۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ان دونوں بینکوں میں سے موخرالذکر بینک کو زیادہ بیمہ پالیسیاں ملیں گی کیونکہ ایسے لوگ کم ہوں گے جو بینک کو یہ لکھنے کی زحمت کریں گے کہ ہم پر بیمہ مسلط نہ کیا جائے۔ یہی تکنیک ایک بہتر انداز میں سپین کی حکومت نے ایک قانون کی شکل میں

اپنائی اور اعلان کیا کہ مرنے کے بعد لوگوں کے جسم کے اعضا معذور لوگوں کو عطیہ سمجھے جائیں گے تاہم جو شخص خود کو اِس سے باہر رکھنا چاہتا ہے وہ حکومت کو مطلع کر دے، یوں سپین دنیا کا ایسا ملک ہے جہاں اعضا عطیہ کرنے والوں کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے ۔ Nudge Theory کو دنیا کے کئی ممالک نے اپنے مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا ہے۔

برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون نے تو اس مقصد کے لیے Nudge Unit بھی قائم کیا تھا تاکہ nudging کے نت نئے طریقوں سے انسانی رویوں کو دریافت کر کے گورننس بہتر کی جا سکے۔ روزمرہ کے معاملات میں بھی یہی تھیوری کارفرما ہے، لوگ اپنی گراسری خریدتے وقت ایسی چیزیں زیادہ خریدتے ہیں جو سامنے آسانی سے نظر آتی ہیں اور جس کے لیے کسی کو انہیں ٹھوکا (nudge) نہ دینا پڑے، سو حل یہ ہے کہ اگر آپ سافٹ ڈرنک سے چھٹکارا چاہتے ہیں تو مہینے کے سامان میں ڈرنکس کے کین ہی نہ لائیں اور اگر موبائل فون کی لت پڑ چکی ہے تو اسے آف کر کے کمرے سے باہر رکھ کر دیکھیں، نہ نو من تیل ہو گا نہ فون باجے گا۔

ہم پاکستانی بھی چونکہ اسی دنیا کا حصہ ہیں اور ویسے ہی آرام طلب ہیں سو اپنے ہاں بھی یہ تھیوری پوری طرح لاگو ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ذمے کوئی کام نہیں، سارا کام حکومت کا ہے، لہٰذا کوئی ہمیں ٹھوکا نہ دے کہ گلی میں کوڑا مت پھینکو یا تجاوزات سے سڑک مت روکو، ہم نے یہ غیر دانشمندانہ اور سہل پسندانہ فیصلے خود ہی کر رکھے ہیں اور اب اِس امید پر بیٹھے ہیں کہ کوئی فوق البشر آ کر یہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔ یہ امید لگانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے وزن کم کرنے کی نیت کرنا اور پھر اگلے ہی لمحے رس ملائی کا آرڈر دے کر سوچنا کہ ایک مرتبہ کھانے سے کچھ نہیں ہوتا!

جاوید چودھری

Art Of Thinking

کیلیفورنیا کے اس نرسنگ سکول کا پرچہ بہت دلچسپ تھا۔ پرچے میں دس سوال تھے،نو سوال میڈیکل سائنس طبی سہولتوں اور مریضوں کی نگہداشت سے تعلق رکھتے تھے جبکہ آخری سوال نرسنگ سکول کی سوپیر کے بارے میں تھا۔ ایگزامینر نے زیرتربیت فی میل اور میل نرسوں سے پوچھا تھا''آپ سکول کے کوریڈور صاف کرنے والی سوپیر کا نام لکھیں''۔طالب علم یہ سوال پڑھ کر حیران رہ گئے۔ یہ میڈیکل کا پرچہ تھا اور میڈیکل کے پرچے میں اس قسم کا سوال بے تکا اور غیر ضروری دکھائی دیتا تھا۔

کمرہ امتحان میں ایک طالب علم نے ہاتھ اٹھایا' ایگزامینر نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا''یس''۔طالب علم نے پوچھا''کیا آخری سوال کے نمبر دوسرے سوالوں کے برابر ہیں؟''ایگزامینر نے ہاں میں سر ہلایا اور پرجوش لہجے میں جواب دیا''سو فیصد''۔طالب علم مزید حیران رہ گئے۔

یہ نوجوان جوں جوں دسویں سوال کی طرف بڑھ رہے تھے انہیں اسی قدر بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ چار سال سے اس سکول میں پڑھ رہے تھے'ان چار برسوں میں ہر طالب علم نے اس سوپیر کو دن میں اوسطاً چار پانچ مرتبہ دیکھا تھا لیکن کسی نے اس کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی' یہ لوگ صبح سکول آتے تھے تو خاتون سوپیر وائپر سے کوریڈور صاف کر رہی ہوتی تھی' یہ لوگ کلاس روم سے لیبارٹری آتے تھے تو یہ خاتون کو اسے لیبارٹری کے شیشے صاف کرتے دیکھتے تھے۔

دوپہر کی لنچ بریک کے دوران یہ خاتون سکول کا لان صاف کرتی دکھائی دیتی تھی اور سہ پہر کو جب طالب علم ہاسٹل کی طرف روانہ ہوتے تھے تو یہ ڈسٹ بن کی صفائی میں مصروف ہوتی تھی۔ آندھی ہو'طوفان ہو'بارش ہو' گرمی ہو یا پھر سردی ان طالب علموں نے اس خاتون کو ہمیشہ کیمپس

میں کام کرتے دیکھا لیکن کوئی طالب علم کبھی اس خاتون کے پاس نہیں رکا‘ کسی نے اس سے ہاتھ نہیں ملایا اور کسی نے اس کا نام جاننے کا تکلف نہیں کیا۔

یہ رویہ صرف اس خاتون سوئیپر تک محدود نہیں‘ ہم سب لوگ اسی ’’مائینڈ سیٹ‘‘ کے مالک ہیں‘ ہم کبھی اپنے سے کم تر سٹیٹس کے لوگوں کا نام اور حال معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے‘ ہمیں اپنے افسروں اور مالکان کے آنے سے پہلے ان کے نام‘ ان کے والدین کے نام‘ ان کے بچوں کے نام حتیٰ کہ ان کے عزیزوں‘ رشتے داروں اور دوستوں تک کے نام معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ہماری توجہ ماتحتوں کی طرف شفٹ ہوتی ہے تو ہم ان کے درجوں اور سٹیٹس کے مطابق ان کے ناموں سے لاتعلق ہوتے چلے جاتے ہیں‘ ڈائریکٹر کیلئے ڈپٹی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر محض اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ ان افسروں کیلئے سیکشن افسر‘ اسسٹنٹ اور سٹینوگرافر ناقابل توجہ ہو جاتے ہیں اور یہ ان کا نام معلوم کرنا یا ان کا نام یاد رکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ پیچھے رہ جاتے ہیں کلرک‘ چپڑاسی‘ چوکیدار اور سوئیپر تو یہ لوگ ایسی مخلوق ہیں جس کے ناک‘ کان‘ آنکھیں‘ بازو اور ٹانگیں تو انسانوں جیسی ہوتی ہیں لیکن یہ انسان نہیں ہوتے۔ چنانچہ جس طرح ہماری نظر میں تمام بطخیں محض بطخیں‘ تمام مرغیاں صرف مرغیاں اور تمام بلیاں صرف بلیاں ہوتی ہیں بالکل اسی طرح ہم لوگ تمام سوئیپرز کو سوئیپرز‘ تمام چوکیداروں کو چوکیدار اور تمام چپڑاسیوں کو چپڑاسی سمجھتے ہیں اور ہمارا دماغ یہ سمجھنے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتا کہ ان بے چاروں کا بھی کوئی نام ہو سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے ہم لوگ کبھی ان کا نام جاننے یا ان کا نام یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتے‘ ہم اپنی یادداشت کو صرف بالائی طبقوں پر استعمال کرتے ہیں۔ ان طالب علموں کے ساتھ بھی یہی ہوا‘ یہ اس سوئیپر کو روز دیکھتے تھے لیکن ان میں سے کسی نے اس کا نام پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی یہاں تک کہ امتحان کا دن آ گیا۔ امتحان کے وقت بھی وہ خاتون سوئیپر معمول کے مطابق عمارت کے شیشے صاف کر رہی تھی لیکن اس دن طالب علم پرچے سے نظریں اٹھا اٹھا کر اس کی طرف دیکھ

رہے تھے۔ اوراس دن ان نوجوانوں کو پہلی بار معلوم ہوا خاتون سوپیر کے بال مہندی رنگ کے ہیں‘ وہ ذراسی فربھی مائل ہے اوراس کی ایک آنکھ دوسری آنکھ سے چھوٹی ہے‘ پوری کلاس میں سے صرف فلپ کواس کا نام معلوم تھا‘ فلپ نے سوپیر کا نام لکھا اور پرچہ ممتحن کو دے کر باہر آ گیا‘ اس نے سوپیر سے ہاتھ ملایا‘ جھک کراس کا شکریہ ادا کیا اور عمارت سے نکل گیا۔ خاتون سوپیر بڑی دیر تک اپنا ہاتھ دیکھتی رہی کیونکہ کالج کی ہسٹری میں پہلی بار کسی طالب علم نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا۔

میں نے یہ کہانی کل عرفان جاوید کو سنائی تو اس نے جواب میں مجھے روسی کہانی سنا دی۔ ماسکو شہر میں ایک کوچوان رہتا تھا‘ یہ کوچوان شہر کے ایک چوک سے پروفیسروں‘ اعلیٰ سرکاری افسروں اور ڈاکٹروں کو اٹھاتا تھا اور دوسرے چوک میں پہنچا دیتا تھا۔ وہ دس پندرہ بیس برسوں سے یہ کام کررہا تھا‘ ایک دن وہ کام پر نہ آیا‘ اس کی سواریوں نے دوسرا تانگہ لے لیا‘ وہ دس دن غائب رہا‘ سواریاں دوسرا تانگہ لیتی رہیں‘ دس دن بعد وہ واپس آیا تو اس کا خیال تھا اس کی سواریاں اس سے پوچھیں گی ”پیٹر تم دس دن تک کہاں غائب رہے“ لیکن سواریوں کیلئے وہ محض ایک کوچوان تھا وہ آ گیا تو ٹھیک ہے‘ نہیں آیا تو دوسرا کوچوان لے لیا‘ بات ختم چنانچہ کسی نے اس سے نہیں پوچھا ”پیٹر تم اتنے دن کہاں رہے؟“ وہ سارا دن ہر مسافر کی طرف اس امید سے دیکھتا رہا کہ وہ اس سے دس دنوں کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھے گا لیکن کسی نے نہ پوچھا‘ رات ہوئی تو اس نے تانگہ کھڑا کیا‘ گھوڑا کھولا اور اسے اصطبل میں لے گیا‘ اس نے گھوڑے کی کاٹھی اتاری‘ اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اوراس سے مخاطب ہوا ”میرے دوست مجھے یقین ہے تم مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو‘ میں دس دن کام پر کیوں نہیں آیا‘ میرے بھائی میرا اکلوتا بیٹا فوت ہو گیا تھا۔ میں نے اس بیٹے کو بڑی مشکل سے پالا تھا‘ یہ جوان ہوا‘ بیمار ہوا اور دس دن پہلے انتقال کر گیا۔ چنانچہ میں اس کی وجہ سے کام پر نہیں آ سکا لیکن میں آج سے ریگولر ہوں“ آپ اگر غور کریں تو ماسکو کا وہ

کو چوان، کیلیفورنیا کی وہ سوپیر اور پاکستان کے تمام لوئر گریڈ ورکرز ایک ہی المیے کے ساتھ منسلک ہیں، ان لوگوں کو دنیا کے کسی کونے میں انسان کا سٹیٹس حاصل نہیں۔ یہ لوگ تیس، تیس سال تک ایک ہی دفتر، ایک ہی گھر، ایک ہی گلی اور ایک ہی فیکٹری میں کام کرتے رہتے ہیں لیکن کوئی شخص ان کا نام تک جاننے کی زحمت نہیں کرتا، یہ لوگ بیمار ہو جائیں تو ان کی جگہ دوسرا سوپیر، دوسرا چپڑاسی، دوسرا چوکیدار اور دوسرا گیٹ کیپر آ جاتا ہے اور صاحب کو معلوم ہی نہیں ہوتا اللہ دتہ، محمد جمیل یا جوزف دفتر کیوں نہیں آ رہا۔ بڑے لوگ اس کے وجود اور اس کے وجود کو درپیش مسائل تک سے ناواقف رہتے ہیں، محلے داروں نے گلی میں کبھی جھانک کر اس جمعدار کا نام نہیں پوچھا جو روزانہ منہ اندھیرے گلی میں آتا ہے اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہماری گلی اور ہماری نالیاں صاف کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے ہماری گلیاں، ہمارے گھر صاف ہیں، ہم وین، بس اور ٹیکسی کے اس ڈرائیور کا نام بھی نہیں پوچھتے جس کے ساتھ ہم روزانہ سفر کرتے ہیں اور جس دن یہ نہیں آتا اس دن اس کا بیٹا، اس کا بھائی یا کوئی عزیز ڈیوٹی پر آ جاتا ہے اور ہم نے کبھی اس کے واپس آنے پر اس سے اس کا دکھ شیئر نہیں کیا، ہم نے کبھی نہیں سوچا ماں چپڑاسی کی ہو یا چیئرمین کی وہ ماں ہی ہوتی ہے اور اگر یہ ماں فوت ہو جائے تو اس کا دل بھی اتنا ہی دکھی ہوتا ہے جتنا ہمارا ہو سکتا ہے۔ ہمیں بس ایک مالی، ایک خانساماں، ایک چوکیدار اور ایک چپڑاسی چاہیے ہوتا ہے، وہ محمد بشیر ہو، اللہ دتہ ہو یا پھر جوزف ہو ہماری نظر میں وہ محض چپڑاسی اور مالی ہوتا ہے اور ہم نے کبھی نہیں سوچا اس مالی، اس چوکیدار کے سینے میں بھی دل ہے اور یہ بھی انسان ہونے کے ناتے اتنا ہی دکھ اور اتنی ہی خوشی محسوس کرتا ہے جتنی ہم لوگ کرتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں یہ لوگ اپنے دکھ کس کو سناتے ہوں گے؟ کیونکہ آج کل تو گھوڑے بھی نہیں ہوتے کہ یہ لوگ انہیں اپنا دکھ سنا کر خود کو ہلکا پھلکا کر لیں۔

کاش ہم لوگ آج سے ان لوگوں کے نام جاننا شروع کر دیں جن سے کسی نے کبھی نام نہیں پوچھا۔

زینب عبداللہ

غم والم ایک نعمت بھی......

اس دنیا کی زندگی کے مختلف ادوار میں انسان کو ہزار ہا قسم کے غموں کا سامنا ہوتا ہے۔ مگر ان تمام غم والم کی ایک ہی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ سارے غم اس فانی دنیا کی عارضی آسائشوں سے محرومی یا محرومی کے اندیشے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان تمام غموں کے پیش آنے پر انسانی ردعمل کو ہم دو بنیادی اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ردعمل وہ ہے جو صبر، حوصلے، برداشت اور غموں کے باوجود راہ حق پر قائم رہنے سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ ردعمل رب تعالیٰ کی صحیح معرفت کے حصول کے لیے ایک ذریعے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ یہ ہمیں اپنے خالق، مالک اور اپنے رب سے قریب تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس رویے کے ساتھ ہر نیا غم اور محرومی ہمارے اور اللہ سبحان وتعالیٰ کے تعلق میں بے مثال خوبصورتی اور پختگی کا احساس تازہ کرتا چلا جاتا ہے اور ہمارے باطن کی پاکیزگی کا موجب بن جاتا ہے۔

دوسرا ردعمل وہ ہے جو شکوہ شکایت، ناشکری، بداخلاقی اور جھنجھلاہٹ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے غم اس دنیا کی محرومی کے سوا ہمیں کچھ نہیں دے پاتے۔ ہم دنیا میں تو ان کی وجہ سے دکھ اٹھاتے ہیں، مگر ان کے بدلے اخروی زندگی کے کسی اجر و ثواب اور رب تعالیٰ سے کسی ملاقات کا کوئی وعدہ نہیں۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام غموں میں اپنے ردعمل کا جائزہ لیں۔ اگر پہلے ایسا نہیں کیا تو اب یہ کوشش کرنی ہے کہ اب سے ان غموں میں پوشیدہ نعمت کو پہچان سکیں اور انھیں رب تعالیٰ سے قربت کے حصول اور باطن کی پاکیزگی کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ ایسی پاکیزگی جو انشاءاللہ ہمیشہ کی زندگی میں اللہ سبحان وتعالیٰ کی صحبت کے قابل بنا دے گی۔

ابویحییٰ

مضامین قرآن (53)

حقوق باری تعالیٰ: حج، عمرہ اور قربانی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بیان ہونے والے مطالبات کی بحث کے آغاز میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ قرآن مجید ان مطالبات کو عبادت یا بندگی کے جامع عنوان سے بیان کرتا ہے۔ اس بندگی کے تین بنیادی اجزا ہیں۔ یعنی اپنے معبود کی پرستش، اس کی اطاعت اور اس کی حمیت وحمایت کا جذبہ۔ دین کی تمام عبادات انھی تین چیزوں کا علامتی اظہار ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ پرستش اور روزہ اور اعتکاف اطاعت کا علامتی اظہار ہیں۔ جبکہ حج، عمرہ اور قربانی اپنے مالک کی حمیت وحمایت، اس کے لیے خود کو نذر کر دینے یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی جان دے دینے کا بھی علامتی اظہار ہیں۔

حج، عمرہ، قربانی: مقصد وحقیقت

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ شیطان انسان کا دشمن ہے۔ وہ اس دشمنی کی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں کہ تخلیق آدم کے وقت ابلیس نامی جن نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ انکار نہ صرف اللہ تعالیٰ سے کھلی بغاوت تھا بلکہ خدا کی اس اسکیم کے خلاف اعلان جنگ بھی تھا جس کے تحت اس دنیا میں انسانوں کو امتحان کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ شیطان نے اپنی اس جنگ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ لی تھی۔ شیطان نے یہ مہلت اس لیے مانگی تھی کہ اسے انسانوں کو گمراہ کرنے کا موقع دے کر یہ ثابت کرنے کی اجازت دی جائے کہ انسان خدا کے شکر گزار نہیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اسے یہ مہلت دے دی بلکہ اسے یہ موقع بھی دیا کہ اس کی ذریت، اس کا

قبیلہ اور اس کے لشکر پوری آزادی سے انسانوں کو راہِ خدا سے بھٹکائیں اور اس طرح جہنم کی اسی سزا کے حقدار بنیں جس کا مستحق ابلیس ملعون ٹھہرا ہے۔ البتہ ان کو صرف وسوسہ انگیزی کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ انسان کے ارادے کے برخلاف جبر کر کے اسے راہ حق سے ہٹا سکیں۔

حضرت آدم کو ایک عارضی مقام پر رکھ کر انھیں یہ تجربہ کرا دیا گیا تھا کہ کس طرح شیطان وسوسہ انگیزی کر کے انسانوں کو بہکانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی شیطانوں کے لشکروں کی طرف سے انسانیت کو بہکانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک صورتحال یہ ہو چکی تھی کہ شیطان نے اپنے مقصد میں بھرپور کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ہر طرف شرک کا دور دورہ تھا اور توحید کے نام لیوا خال خال ہی پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو یہ حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس خدمت کے لیے وقف کر دیں کہ وہ بیت اللہ میں صرف ایک اللہ کی عبادت، اسی کی پرستش اور اسی کے لیے قربانی کا ایک نظام قائم کریں۔ تاکہ دنیا بھر میں جو بھی خدا پرست ہیں وہ بیت اللہ کے حج وعمرہ کے لیے آئیں اور اپنی عبادت اور قربانی کو خدا کے لیے خاص کر کے اپنے عمل سے پوری دنیا کو یہ پیغام دیں کہ شیطان کو اس جنگ میں خالی میدان نہیں ملے گا بلکہ زبردست مزاحمت پیش آئے گی۔

چنانچہ اسی زمانے سے حج وعمرہ کی عظیم عبادت باقاعدہ ادا کی جانے لگی۔ عرب کے مخصوص بدامنی کے ماحول میں رجب کا مہینہ عمرے کی ادائیگی اور ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے مہینے حج کی عبادت کے لیے حرام قرار دیے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مہینوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے گا اور ہر قسم کی جنگ وجدل اور خونریزی سے پرہیز کیا جائے گا۔ تاہم عمرہ سال میں کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ لوگ کسی بھی وقت عمرہ کا احرام باندھ کر دور دراز سے مشقت اٹھا کر اور دنیوی زینتوں سے قطع تعلق کر کے کر مکہ مکرمہ حاضر ہوتے ہیں اور حرم پاک کے پھیرے لگا کر خدا

سے اپنی وفاداری کا اعلان کرتے ہیں۔ پھر اپنے بال مونڈھ کر زمانہ قدیم کے دستور کے مطابق یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ خدا کے غلام ہیں اور خود کو اس کی بندگی اور اطاعت کے لیے نذر کر چکے ہیں۔

عمرہ کے برخلاف جو ایک نفل عبادت ہے، حج کی عبادت ہر اس مسلمان پر زندگی میں ایک دفعہ فرض ہے جو حرم تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ حج کی یہ عظیم عبادت سال میں ایک دفعہ مخصوص ایام یعنی 8 سے 13 ذوالحجہ کے دوران میں مکہ، منی، مزدلفہ اور عرفات میں ادا کی جاتی ہے۔ حاجی اپنے اپنے ملکوں اور شہروں سے نکلتے ہیں اور میقات پر پہنچ کر احرام کی پابندیاں اختیار کر لیتے ہیں۔ حج میں عمرے کی طرح خود کو خدا کے لیے نذر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ حقیقت بھی پوری طرح ممثل ہو جاتی ہے جس کے لیے خود کو نذر کیا جا رہا ہوتا ہے۔ یعنی خدا کی حمیت وحمایت کے جذبے سے سرشار انسانوں کی شیطان کے خلاف جنگ۔

اس جنگ کا علامتی اظہار منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے واپس منیٰ تک وہ سعی وجہد ہے جو ایک لشکرِ جہاد کی نقل وحرکت کے مماثل ہے۔ یہ لشکر منی میں جمع ہوتا ہے اور اگلی صبح عرفات میں پہنچ کر خطبہ حج سن کر گویا جنگ کے لیے اپنے امام سے رہنمائی لیتا ہے۔ پھر دن بھر دعا وزاری کر کے اس جنگ میں اپنے رب کی مدد مانگتا ہے۔ سرشام یہ لشکر مزدلفہ کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں جہاد کی تمثیل کے مطابق ہی ہر موقع پر نمازیں جمع وقصر کی جاتی ہیں۔ مزدلفہ میں شب بسری کے بعد یہ لشکر صبح دم منیٰ لوٹتا ہے اور رمی جمار یا شیطان کی علامت پر سنگباری کرتا، اپنا سر منڈوا کر خود کو اپنے رب کی نذر کر دینے کا اعلان کرتا اور آخر میں کعبہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کر کے خدا سے وفاداری اور اس کی شکر گزاری کا اظہار کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد اگلے دو یا تین دن منیٰ میں رک کر خدا کی یاد اور شیطان پر سنگباری کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ پورا عمل علامتی طور پر اس بات کا اظہار ہے کہ انسان نے خود کو اپنے رب کی نذر کر دیا ہے اور اس نذر کا اصل مقصد شیطان کے خلاف جنگ ہے۔

حج وعمرہ کی عبادت میں قربانی ایک نفل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عیدالاضحیٰ کے تہوار کے موقع پر بھی جو حج کی مناسبت سے اسی موقع پر باقی سارے مسلمان مناتے ہیں بطور ایک عبادت جاری کیا ہے۔ یہ قربانی سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل کے اس بے مثال واقعے کی یادگار ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ حضرت ابراہیم کو خواب میں یہ دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہے ہیں۔ مگر خلیل اللہ اور ان کے جلیل القدر صاحبزادے نے اللہ تعالیٰ سے اس خواب کی کوئی تعبیر یا توجیہ دریافت کرنے یا کسی مزید خدائی حکم کا انتظار کرنے کے بجائے بعینہٖ اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو باپ بیٹے کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ جس طرح اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جانور کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اسی طرح ان کے پیروکاروں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ جانور کی قربانی کر کے اپنی جان خدا کے لیے نذر کرنے کی اس آخری مثال کی یادگار کو قائم و دائم رکھیں۔ چنانچہ آج جب مسلمان جانور قربان کرتے ہیں تو زبانِ حال سے وہ یہی پیغام دیتے ہیں کہ ان کی زندگی خدا کے لیے نذر رہے اور اسی راہ میں ان کی موت بھی آئے گی۔ یہ گویا کہ اس شیطان کے منہ پر ایک چانٹا لگانے کا عمل ہے جس نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنا شکرگزار نہیں پائیں گے۔

عمرہ، حج اور قربانی تینوں میں نذر کی تمثیل اور خدا کی حمیت وحمایت کا یہ جذبہ کہ انسان اپنی زندگی اور حتیٰ کہ موت بھی خدا کے لیے کر دے شکرگزاری اور بندگی کا ایسا اظہار ہے جس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

قرآن مجید اور حج، عمرہ اور قربانی

نزولِ قرآن کے وقت مشرکین عرب ان تینوں عبادات سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھے بلکہ ان کو پورے اہتمام سے اختیار کیے ہوئے تھے۔ البتہ انھوں نے ان میں بہت سے توہمات اور مشرکانہ بدعات کو شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان عبادات کے حوالے سے زیادہ تر بحث اسی پس منظر میں ہوئی ہے کہ عرب میں رائج ان توہمات اور مشرکانہ بدعات کی تردید کی

جائے اوران عبادات کو ہر قسم کے اضافوں اور خرابیوں سے پاک کر کے اُس خالص شکل میں جاری کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب تھی۔ ضمناً اس میں شریعت کے احکام، تاریخ، حکمت و مصالح سب کا بیان بھی آ گیا ہے۔ان میں سے تاریخ اور مصالح پر ہم قرآن مجید کی روشنی میں اوپر بات کر چکے ہیں جبکہ احکام اوراصلاحات شریعت کے بیان میں زیر بحث آئیں گے۔

حج و عمرہ اور قربانی کے حوالے سے یہ مضامین اصلاً سورۃ الحج اور سورۃ البقرہ میں اور ضمنی طور پر سورۃ آل عمران، سورۃ المائدہ اور سورۃ التوبہ میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ الحج وہ سورت ہے جس میں ہجرت کے بعد پہلی دفعہ مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی۔ اس کے پس منظر میں یہ حقیقت تھی کہ کفار کے ظلم و ستم نے مسلمانوں کو نہ صرف جان و ایمان بچانے کے لیے ہجرت پر مجبور کر دیا بلکہ حرم میں ان کی حاضری کی راہ بھی مسدود کر دی تھی۔ چنانچہ ایک طرف کفار کی مشرکانہ بدعات تھیں اور دوسری طرف حرم کی راہ روکنے کا وہ جرم تھا جس کی بنا پر مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ اتمام حجت کے بعد ان کے خلاف جہاد کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ سورۃ البقرہ میں کفار کے مذکورہ بالا جرائم کی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان سے جنگ کریں اور ان مشرکین سے سرزمین عرب کو پاک کر دیں۔ چنانچہ دونوں سورتوں میں جہاد کے ان احکام کے ساتھ ساتھ ہی حج کے سارے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی اس بے مثال ترتیب سے حج اور جہاد کا تعلق نہ صرف پوری طرح واضح کر دیا بلکہ حج و عمرہ کی اس اسپرٹ کو بھی پوری طرح نمایاں کیا ہے کہ یہ حمیت حق کے جذبے کی ایک تمثیل ہے جس میں بندہ مومن اپنے آپ کو راہ خدا کے لیے نذر کر دیتا اور اس راہ میں اپنی جان دینے کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔

''(تمھاری سرگذشت یہ ہے کہ) ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا، پھر تمھاری صورتیں بنائی تھیں، پھر فرشتوں سے کہا تھا: آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ سو ابلیس کے سوا سب سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا۔ فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے

روک دیا، جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ بولا: میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُس کو مٹی سے۔ فرمایا: اچھا تو یہاں سے اتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے، سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ بولا: مجھے اُس دن تک مہلت دے، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: تجھے مہلت ہے۔ بولا: تو مجھے تو نے گمراہی میں ڈالا ہے، اِس لیے اب میں بھی اولادِ آدم کے لیے ضرور تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر اِن کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اِن پر تاخت کروں گا اور تو اِن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا: نکل جا یہاں سے، ذلیل اور راندہ۔ (یاد رکھ کہ) اِن میں سے جو تیری پیروی کریں گے، میں تم سب سے اکٹھے جہنم کو بھر دوں گا۔ اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔ پھر شیطان نے اُنھیں بہکایا کہ اُن کی شرم گاہوں میں سے جو چیز اُن سے چھپائی گئی تھی، وہ اُن کے لیے کھول دے۔ اُس نے اُن سے کہا: تمھارے رب نے تمھیں اِس درخت سے صرف اِس وجہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھیں ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔ اُس نے قسمیں کھا کر اُن سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اِس طرح فریب دے کر اُس نے دونوں کو رفتہ رفتہ مائل کر لیا۔ پھر جب اُنھوں نے درخت کا پھل چکھا تو اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھل گئیں اور وہ اُس باغ کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے۔ (اُس وقت) اُن کے پروردگار نے اُنھیں پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اِس درخت سے روکا نہیں تھا اور تم سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟ دونوں بول اٹھے: پروردگار، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور نامراد ہو جائیں گے۔ فرمایا: (یہاں سے) اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔'' (الاعراف 7: 11-24)

''اِس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں: ابراہیم کا مسکن ہے، جو اِس میں داخل ہو جائے، وہ مامون ہے اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن پر اللہ کے لیے اِس گھر کا حج ہے۔ (یہ اِس کی نشانیاں ہیں)، اور جو (اِس کے بعد بھی) انکار کریں (اللہ کو اُن کی کچھ پروا

نہیں)، اِس لیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''، (آل عمران 3:97)

''یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے (خدا کے پیغمبر کو) ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اب وہ خدا کی راہ سے روک رہے ہیں اور مسجد حرام سے بھی جسے ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا ہے، خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے، (اُنھوں نے بڑے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ اِس لیے کہ اِس مسجد کا معاملہ تو یہ ہے کہ) جو اِس میں کسی انحراف، کسی ظلم کے ارتکاب کا ارادہ کرے گا، اُس کو ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (اِنھیں یاد دلاؤ)، جب ہم نے ابراہیم کے لیے اِس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا تھا، (اِس ہدایت کے ساتھ) کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا۔ اور (حکم دیا تھا کہ) لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ تمھارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور ہر طرح کی اونٹنیوں پر سوار ہو کر بھی کہ (سفر کی وجہ سے) دبلی ہو گئی ہوں گی۔ وہ (قافلوں کی آمد و رفت سے) گہرے ہو چکے ہر دور دراز پہاڑی راستے سے آئیں گی۔ اِس لیے (آئیں گے) کہ اپنی منفعت کی جگھوں پر حاضر ہوں اور چند متعین دنوں میں اُن مواشی جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُنھیں بخشے ہیں۔ (تم اُن کو ذبح کرو) تو اُن سے خود بھی کھاؤ اور برے حال فقیروں کو بھی کھلاؤ۔ پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور اِس قدیم گھر کا طواف کریں۔ یہ باتیں ہیں (جو ابراہیم کو بتائی گئی تھیں۔ اِن کو اچھی طرح سمجھ لو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں کی تعظیم کرے گا تو اُس کے پروردگار کے نزدیک یہ اُس کے حق میں بہتر ہے۔ اور (یہ بھی کہ جانوروں کے بارے میں اِن مشرکین کے توہمات بالکل بے بنیاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ) تمھارے لیے چوپائے حلال ٹھیرائے گئے ہیں، سوائے اُن کے جو تمھیں (قرآن میں) بتائے جا رہے ہیں۔ سو بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی (جو اُن کے حوالے سے کسی چیز کو حلال اور کسی کو حرام ٹھیرا کر اللہ پر باندھتے ہو اور اُس کے شعائر کی تعظیم کرو)۔ اللہ کی طرف یک سو ہو کر، کسی کو اُس کا شریک کر کے نہیں۔ اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے شریک ٹھیراتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا ہے۔ اب پرندے اُس کو اچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو کسی دور دراز جگہ پر لے جا کر پھینک دے گی۔ یہ باتیں ہیں، (اِنھیں اچھی طرح سمجھ لو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے

مقرر کردہ شعائر کی تعظیم کرے گا تو یہ دلوں کی پرہیزگاری میں داخل ہے۔ (یہ ہدی کے جانور بھی اللہ کے شعائر میں سے ہیں، لیکن اللہ کا حکم یہ ہے کہ) اِن میں تمھارے لیے ایک مقرر وقت تک طرح طرح کی منفعتیں ہیں، پھر اِن کو (قربانی کے لیے) خدا کے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔ ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کی عبادت مشروع کی ہے تاکہ اللہ نے جو مواشی جانور اُن کو بخشے ہیں، اُن پر وہ اللہ کا نام لیں، (کسی اور کا نہیں)، اِس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کرو اور اُنھیں خوش خبری دو جن کے دل اُس کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو اُن کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اُن پر جو مصیبت آتی ہے، اُس پر صبر کرنے والے اور نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو بخشا ہے، اُس میں سے وہ (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ (اونٹ کی قربانی میں بھی تم میں سے کسی کو تردد نہیں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر الٰہی میں شامل کیا ہے۔ اُن میں تمھارے لیے بڑے خیر ہیں۔ سو اُن کو صف بستہ کرکے اُن پر بھی اللہ کا نام لو۔ پھر جب (قربانی کے بعد) وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو (محتاج ہیں، مگر) قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو مانگنے کے لیے آجائیں۔ اِن جانوروں کو ہم نے اِسی طرح تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اللہ کو نہ اِن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اِن کا خون، بلکہ اُس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اِسی طرح اللہ نے اُن کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور (اے پیغمبر)، اُن لوگوں کو بشارت دو جو خوبی کا رویہ اختیار کرنے والے ہیں۔''، (الحج 22: 37-25)

''اور یاد کرو، جب ہم نے کہا کہ اِس بستی میں داخل ہو جاؤ، پھر اِس میں سے جہاں سے چاہو، مزے سے کھاؤ اور (یاد رکھو کہ) اِس کے دروازے میں (عجز کے ساتھ) سر جھکائے ہوئے داخل ہونا اور دعا کرنا کہ (پروردگار)، ہمارے گناہ بخش دے، ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور (تم میں سے) وہ لوگ جو اچھا رویہ اختیار کریں گے، اُن پر ہم اور بھی عنایت فرمائیں گے۔ پھر جو بات اُن سے کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے ایک دوسری بات سے

بدل دیا۔ چنانچہ اِن ظلم کرنے والوں پر ہم نے اُن نافرمانیوں کے باعث جو وہ کررہے تھے، آسمان سے عذاب اتارا۔‘‘(البقرہ2: 59-58)

’’(بیت الحرام ہی کی طرح صفاومروہ کی حقیقت بھی اِن یہودیوں نے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔لہٰذا تحویل قبلہ کے اِس موقع پر یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ)صفااورمروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اِس گھر کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں، اُن پر کوئی حرج نہیں کہ وہ اِن دونوں کا طواف بھی کرلیں، (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے)اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اللہ اُسے قبول کرنے والا ہے، اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔‘‘،(البقرہ2:158)

’’وہ تم سے حرام مہینوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: یہ لوگوں کی بہبوداور حج کے اوقات ہیں، (اِس لیے اِن کی یہ حرمت اِسی طرح قائم رکھی جائے گی)۔اور(تم نے یہ سوال کیا ہے تو اب یہ بھی جان لو کہ) یہ ہرگز کوئی نیکی نہیں ہے کہ(احرام کی حالت میں اور حج سے واپسی پر)تم گھروں کے پیچھے سے داخل ہوتے ہو۔ بلکہ نیکی تو اصل میں اُس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔اور (یہ بھی کہ اب)تم گھروں میں اُن کے دروازوں ہی سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمھیں فلاح نصیب ہوجائے۔‘‘،(البقرہ2:189)

’’اور حج وعمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ پس اگر تم گِھر جاؤ تو جو ہدی میسر ہو وہ پیش کردو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک ہدی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کے لیے روزے یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔ جب اطمینان کی حالت ہو تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسر آئے۔ جس کو میسر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے دوران حج میں رکھے اور سات دن کے روزے واپسی کے بعد۔ یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ ان کے لیے ہے جن کا گھر درجوار حرم میں نہ ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ حج کے متعین مہینے ہیں تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کرلے تو پھر اس کے لیے حج تک نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے، نہ فسق و فجور کی، نہ لڑائی جھگڑے کی۔ اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور اس کے لیے تقویٰ کا زادراہ لو۔ بہترین زادراہ تقویٰ کا زادراہ ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو۔

اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کے فضل کے طالب بنو۔ پس جب عرفات سے چلو تو خدا کو یاد کرو مشعرِ حرام میں ٹھہر کر اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح خدا نے تم کو ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں تھے۔ پھر تم بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں کامیابی عطا کر، حالانکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔''، (البقرہ 2: 200-196)

''اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ سو جو دو ہی دنوں میں اٹھ کھڑا ہو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ رعایت ان کے لیے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھیں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔''، (البقرہ 2:203)

''اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر کو، لوگوں کے لیے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں، قربانی کے جانوروں اور گلے میں پٹے پڑے جانوروں کو شعیرہ ٹھہرایا۔ یہ اس لیے کہ تم جانو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ خبردار ہو جاؤ، اللہ سخت سزا دینے والا بھی ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔''، (المائدہ 5: 98-97)

''بے شک مہینوں کی تعداد، اللہ کے ہاں، نوشتۂ الٰہی میں، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا بارہ مہینے ہیں جن میں چار حرمت والے ہیں۔ یہی دین قیم ہے تو تم ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ ڈھانا۔ اور مشرکوں سے جنگ کرو من حیث الجماعت، جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں من حیث الجماعت۔ اور جان رکھو کہ اللہ خدا ترسوں کے ساتھ ہے۔''، (التوبہ 9:36)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (57)

مجھے ذاتی طور پر شعر و شاعری اور خاص طور پر فارسی شاعری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں انتہا پسندی کی حد تک حقیقت پسند ہوں۔ حقائق خواہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں، مجھے خوبصورت سے خوبصورت تخیل سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ شاعری کو پسند کرنے کے لئے انسان کا تخیل پسند ہونا ضروری ہے جو کہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روم کی مثنوی کا مطالعہ کرنے کے لئے میں نے اس کے نثری ترجموں اور شروحات کا مطالعہ کیا ہے۔

مثنوی میں مولانا روم کا طریق کار یہ ہے کہ وہ علمی انداز میں گفتگو کرنے کی بجائے فکشن کی طرز پر چھوٹی چھوٹی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں۔ یہ حقیقی کہانیاں نہیں ہوتیں بلکہ بادشاہوں، شہزادوں، درویشوں، شیاطین، طوطا و مینا اور دیگر جانوروں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کہانی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کہانی مولانا کے خاندان کے لوگوں کی تیار کردہ ویب سائٹ www.mevlana.net سے لی گئی ہے:

تیل کا کاروبار کرنے والے ایک شخص کے پاس ایک طوطا تھا جو بڑی باتیں کیا کرتا تھا۔ جب وہ شخص باہر جاتا تو اس طوطے کو اپنی دکان پر رکھوالی کے لئے چھوڑ جاتا۔ ایک دن طوطا دکان میں اکیلا تھا کہ ایک بلی آئی اور اس نے تیل کا ایک مرتبان الٹا دیا۔ جب سوداگر واپس آیا تو مرتبان کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ طوطے نے ایسا کیا ہے۔ اس نے طوطے کے سر پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کے بال جھڑ گئے اور وہ گنجا ہو گیا۔ اس کے گفتگو کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ کچھ دن بعد طوطا دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گنجا آدمی باہر سے گزرا۔ طوطے کی قوت گویائی واپس آ گئی اور وہ چلایا:

''تم نے کس کا مرتبان الٹایا ہے؟''

طوطے کی اس غلط فہمی سے مولانا یہ سبق اخذ کرتے ہیں کہ جیسے طوطے نے غلط طور پر گنجے پن کا تعلق مرتبان کے الٹنے سے قائم کرلیا، اسی طرح بہت سے لوگ غلط طور پر جعلی پیروں کو ولی اللہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

بعض لوگوں کے خیال میں یہ کہانیاں قبل از اسلام ایران کی دیو مالا سے اخذ کی گئی ہیں۔ کہانی کو بیان کرنے کے بعد وہ اس میں سے سبق اخذ کرتے ہوئے اپنے مخصوص صوفیانہ نظریات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے اس طریق کار نے مثنوی کو بہت پر اثر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی دانوں میں مثنوی بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ مولانا کے بعض غالی عقیدت مند تو نعوذ باللہ مثنوی کو الہامی کتاب قرار دیتے ہیں اور اسے فارسی زبان کا قرآن سمجھتے ہیں۔

مخصوص صوفیانہ نظریات کے علاوہ مثنوی میں بہت سی ایمانی و اخلاقی تعلیمات بھی ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اس کے کچھ اشعار اور ان کا مفہوم پیش خدمت ہیں۔ یہ اشعار حکیم محمد اختر صاحب کے درس مثنوی سے لیے گئے ہیں۔ اللہ تعالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

آہ را جز آسمان ہمدم نبود۔۔۔۔۔ راز را غیر خدا محرم نبود

میں تنہائی میں ایسی جگہ اللہ کا نام لیتا ہوں جہاں اللہ کے سوا میری آہ میں میرا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ میری محبت کے راز کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن۔۔۔۔ صبر چوں داری زرب ذوالمنن

عجیب بات ہے کہ تم بیوی بچوں کی ناراضی پر تو صبر نہیں کر سکتے جبکہ احسان کرنے والے رب کریم کی ناراضی پر صبر کر لیتے ہو۔

دہد نطفہ را صورتے چوں پری۔۔۔۔ کہ کردہ است برآب صورت گری

اے اللہ! تو نے نطفہ کے ایک قطرہ سے اتنی خوبصورت شکل تخلیق کی ہے۔ یہ تو گویا پانی سے نقش ونگار بنانے کے مترادف ہوا۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن ۔۔۔۔ نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

دنیا پرستی خدا سے غفلت کا نام ہے۔ یہ کپڑے، سونا چاندی، اولاد اور بیوی کے ساتھ تعلق کا نام نہیں ہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ۔۔۔۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں

خدا کو بھی چاہتے ہو اور دنیا پرستی بھی اختیار کرتے ہو۔ یہ خیال تو محض پاگل پن اور ناممکن ہے۔

عشق من پیدا ودلبر ناپدید ۔۔۔۔ در دو عالم ایں چنیں کہ دلبر کہ دید

خدا کی محبت تو میرے دل میں پیدا ہو گئی جبکہ میرا محبوب نظروں سے اوجھل ہے۔ دونوں جہان میں کوئی ایسا محبوب تو دکھاؤ کہ جس کو دیکھے بغیر ہر کوئی اس پر جان نثار کر رہا ہو۔

لحن مرغاں را اگر واقف شوئی ۔۔۔۔ بر ضمیر مرغ کے عارف شوئی

(اے جعلی صوفیو!) اگر چہ تم نے چمن کے مرغوں کی آواز کی نقل کر بھی لی، پھر بھی ان کے دل میں جو مضمون ہے، اسے تم کیسے جان سکتے ہو۔

گر بیاموزی سفیر بلبلے ۔۔۔۔ تو چہ دانی کو چہ گوید با گلے

اگر چہ تم نے بلبل کی آواز کی نقل کر بھی لی مگر تمہیں کیا معلوم کہ وہ پھول کے ساتھ کیا گفتگو کرتی ہے؟

کار مرداں روشنی وگرمی است ۔۔۔۔ کار دوناں حیلہ وبے شرمی است

مردوں کا کام سرگرم عمل رہنا ہے جبکہ کمینہ خصلت لوگوں کا کام حیلے بہانے اور بے شرمی سے

(کام سے جی چرانا) ہے۔

پیش نور آفتاب خوش مساغ۔۔۔۔رہنمائی جستن از شمع و چراغ

روشن آفتاب کی موجودگی میں شمع و چراغ سے روشنی حاصل کرنا عجیب بات ہے۔(یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے ہوتے ہوئے ادھرادھر سے ہدایت کی توقع فضول ہے۔)

یکے آں کہ بر غیر بدبیں مباش۔۔۔۔دویم آں کہ بر خویش خود بیں مباش

دوسروں کے عیب تلاش کرنے کی بجائے انسان کو اپنی خامیاں تلاش کرنی چاہییں۔

مرکب توبہ عجائب مرکب است۔۔۔۔تا فلک تازد بیک لحظہ ز پست

توبہ کا مرکب بھی عجیب چیز ہے۔ یہ توبہ کرنے والے کو ایک سیکنڈ میں پستی سے نکال کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔

لیک شیرینی ولذات مقر۔۔۔۔ہست بر اندازہ رنج سفر

منزل پر پہنچنے کے لطف کا اندازہ سفر کی صعوبتوں سے ہی ہوتا ہے۔

ہمچو امرد کز خدا نامش دہند۔۔۔۔تا بداں سالوس دردامش کنند

امرد (ایسا خوبصورت لڑکا جس کی داڑھی نہ نکلی ہو) کو یہ لوگ خدائے حسن کہتے ہیں تاکہ انہیں اپنے جال میں پھنسالیں۔

گھومتے درویشوں کا رقص

قونیہ میں مولانا روم کا مقبرہ موجود ہے۔اس مقبرے کی خاص بات یہاں پر ہونے والا درویشوں کا رقص ہے جو کہ ''سماع'' کہلاتا ہے۔ یہ برصغیر کے چشتی حضرات کے سماع سے خاصا مختلف ہے۔قونیہ میں بہت سے غیر ملکی سیاح صرف یہ رقص دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔اس رقص کا طریقہ کار یہ ہے کہ اس میں چند درویش لمبے لمبے فراک پہن کر اسٹیج پر آتے ہیں۔سر پر انہوں

نے اوندھی بالٹیوں کی طرز کی ٹوپیاں لی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ہاتھ پھیلا کر ایک عالم بے خودی میں خلاف گھڑی وار گردش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان درویشوں کا استاد مختلف رنگ کا سوٹ پہن کر ان کے ساتھ کھڑا موسیقی کی زبان میں انہیں ہدایات جاری کرتا رہتا ہے۔

درویشوں کا یہ رقص دیوانہ وار ہوتا ہے مگر ان کے استاد میں ذرا بھی والہانہ پن نہیں پایا جاتا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہمارے ہاں قوالی کے دوران بہت سے لوگ وجد میں آ کر حال کھیلنے لگتے ہیں مگر قوال کو خود کبھی وجد نہیں آتا۔ اس رقص کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا روم کی نسل کے بزرگ ڈاکٹر جلال الدین جلبی اس سماع کے بارے میں لکھتے ہیں:

سماع کے اندر چار بار سلام کیا جاتا ہے: پہلا سلام سچائی پر انسان کی پیدائش کو بیان کرتا ہے۔۔۔۔ دوسرا اسلام تخلیق کے بارے میں خدا کی عظمت کے بارے میں انسان کے جذبات کو بیان کرتا ہے۔ تیسرا اسلام ان جذبات کو محبت میں تبدیل کر دینے کی علامت ہے۔ انسان عقل کو اس محبت پر قربان کر دیتا ہے۔ یہ مکمل سپردگی کا نام ہے۔ یہ خود کو خدا کی محبت میں فنا کر دینے کا نام ہے۔ بدھ مذہب میں یہ انسان کے لئے سب سے بڑا درجہ ہے جو کہ ''نروان'' کہلاتا ہے۔ اسلام میں اسے ''فنا فی اللہ'' کہا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں سب سے بڑا درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے جو کہ خدا کے بندے پہلے ہیں اور اس کے بعد اس کے رسول ہیں۔۔۔۔۔ چوتھا سلام اسی طرح ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرش پر جا کر واپس آ گئے۔ اسی طرح ایک درویش فنا فی اللہ کی منزل تک پہنچ کر مخلوق کی خدمت کے لئے واپس آ جاتا ہے۔

درویشوں کے اس رقص اور اس میں ان کے والہانہ پن کے بارے میں پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں قرآن مجید کی یہ آیت آئی جس میں اہل مکہ کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ بیت اللہ کے پاس ان کی نماز تالیوں اور سیٹیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھی، (الانفال

(35:8)۔

اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے جذبات اور والہانہ پن کے اظہار کے لئے اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نماز جیسا خوبصورت طریقہ سکھایا ہے۔ انسان اپنے رب کی محبت میں اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اسی کی محبت میں ڈوب کر اس کے سامنے رکوع میں جھکتا ہے۔ پھر اوپر اٹھتا ہے اور پورے جوش و جذبے کے ساتھ اس کے سامنے سجدے میں گر جاتا ہے۔ قرآن مجید سجدے کو اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ بتاتا ہے: واسجد واقترب یعنی سجدہ کر کے میرے قریب ہو جاؤ۔

نماز کے ذریعے انسان اپنے رب کے ساتھ جس قدر محبت و قربت حاصل کر سکتا ہے، اس کا عشر عشیر بھی اسے ان ناچ گانوں سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ یہ انسان کے بنائے ہوئے طریقے ہیں جبکہ نماز اللہ کے پیغمبروں کی میراث ہے۔

پروین سلطانہ حنا

اندیشے

فکر، خوف، اندیشے
بے وجہ ڈراتے ہیں
ناگ بن کے ڈستے ہیں
شکر سے ہٹاتے ہیں
نعمتیں بھلاتے ہیں
کل کی فکر مت کرنا
آج کی خبر رکھنا
رمز آشنا ہے وہ
جانتا ہے سب باتیں
حکمتیں عجب اس کی
ناگوار گزریں تو
خود پہ جبر کر لینا
اور صبر کر لینا

خود کو سونپ کر اس کو
اعتبار کر لینا
اپنے رب کی رحمت پر
بے حساب نعمت پر
دِل کبھی جو گھبرائے
غم زدہ نگاہوں کو
اشک بار کر لینا
کل کی فکر مت کرنا
آج پر نظر رکھنا
آج سرخرو کر لو
کل بھی سرخرو ہو گا
کامیاب لمحوں کا
دور پھر شروع ہو گا

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

ماہنامہ
اِنذار

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجیے......یا
ایک پے آرڈر/بینک ڈرافٹ بنام "ماہنامہ انذار" بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوایئے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جا سکتا ہے